اردو اور انگریزی کے شاہکار ناول: ایک تنقیدی و تقابلی مطالعہ

Keyworlds: Masterpiece, Streame of Consiousness, Romance, Fable, Legend, Myth

محمد یونس انصاری
ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی، دہلی

Abstract: From the review of Urdu and English novels, it is clear that Urdu novels have not only used English novels but also imitated them. Since Deputy Nazeer Ahmad, the Urdu novel has continued its journey under the influence of the English novel. The first example in this regard is the transference of the Englsh word 'novel' to Urdu. Examples of English novels can aslo be found in terms of story, theme, style and technique. In the novels of Aziz Ahmed, there are similiar impressions of D. H. Lawrence. Qurratul Ain Haider was not only familiar with English writers, but their works have also captivated her mind. Ahsan Farooqi is influenced by Jane Austen, Charles Dickens, Fielding, S. T. Coleridge, Virginia Woolf, Henry James, Galsworthy. On the Other hand,

Abdullah Husain seems to find the material of his art in the novels of H. G. Wells and Ernest Hemingway. And Khadija Mastoor's vision of Austen is clearly reflected.In this article an attempt has been made to find out how much Urdu and English novels are related to one another.

.....

کہانی کہنا اورسننا فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔روز اول سے ہی انسان کوکہانی نے بے حد متاثر کیا ہے اورآج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔تمثیل، داستان، حکایت، روایت، رومانس، فیبل اورمتھ سب کہانی کے ہی روپ ہیں۔ پہلے داستان کا رواج تھا پھر حقیقت نگاری کے سبب ناول نے فروغ پایا۔ ناول نگار نے قصہ وکہانی کو محض تفریح کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے معاشرہ کی ضرورت سمجھا اوراسے سماج کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

انگریزی ناول رومانس، فیبل ، لے جنڈ اورمتھ کی نئی شکل لے کر ابھرا اور شاعری وڈرامے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے شہرت ومقبولیت کی بلندیاں طے کرتا گیا جبکہ اردو ناول کا رجحان تمثیل اورداستانوں کے بعد نمودار ہوا۔ مافوق الفطری عناصر، فطری عناصر میں تبدیل ہونے لگے۔ جن، بھوت، پریت اور شیاطین کی جگہ معاشرے کے حقیقی کرداروں کو پیش کیا جانے لگا اور داستانوں کی فرضی دنیا کی جگہ حقیقی دنیا نے لے لی۔اس طرح کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ناول ادب کا حصہ بنا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام اصناف ادب میں اہم مقام حاصل کیا۔

اردو انگریزی ناولوں کے جائزہ سے عیاں ہے کہ اردو ناول نے انگریزی ناول سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس کی تقلید بھی کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد سے لے

کراب تک اردوناول نے انگریزی ناول کے زیراثر اپنے سفرکوآگے بڑھایا ہے۔اس تعلق سے پہلی مثال انگریزی لفظ' ناول' کی ہے جسے اردومیں جوں کا تواخذ کرلیا گیا جس کی وجہ سے انگریزی ناول کی بعض دیگر خصوصیات بھی اردوناول میں داخل ہوگئیں۔قصہ،موضوع،ماحول اورتکنیک وغیرہ کے اعتبار سے بھی انگریزی ناول کے نمونے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔اردوادب میں اس طرح کی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔عزیزاحمد،قرۃ العین حیدر،احسن فاروقی اورعبداللہ حسین جیسے نامورناول نگارکسی نہ کسی حدتک انگریزی ناول سے متاثر ہوئے اور کچھ نہ کچھ اس سے اخذ بھی کرتے رہے۔

عزیزاحمد کے ناولوں میں ڈی ایچ لارنس کے واضح نقوش موجود ہیں۔ انھوں نے لارنس کے ناولوں سے اس قدر استفادہ کیا کہ کہیں کہیں ہوبہونقل معلوم ہوتی ہے۔قرۃ العین حیدرانگریزی ادباکے فکروفن سے نہ صرف واقف تھیں بلکہ ان کی تخلیقات نے ان کے ذہن کو مرعوب بھی کیا ہے۔متعددمقامات پروہ ورجینیا وولف کی تقلید کرتی نظرآتی ہیں۔احسن فاروقی پر جین آسٹن،چارلس ڈکنس، فیلڈنگ،ایس ٹی کولرج،ورجینیاوولف،ہنری جیمس اورگالزوردی کے اثرات غالب ہیں۔اس بات کاانھوں نے متعددمقامات پر ذکر کیا ہے۔ادھرعبداللہ حسین ایچ جی ویلز اورارنیسٹ ہیمنگ وے کے ناولوں میں اپنے ناول کا خام مواد تلاش کرتے نظرآتے ہیں تو وہیں دوسری طرف خدیجہ مستور کے یہاں جین آسٹن کا تاثر صاف جھلکتا ہے۔

عزیزاحمد کے ناولوں میں انگریزی ناول کے اثرات نمایاں طور پرنظرآتے ہیں۔انھوں نے جنسی رجحانات ومیلانات کے لحاظ سے جس طرح بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیزاحمد نے ڈی ایچ لارنس کو اپنااستادتسلیم کرلیا ہو۔لارنس کی فن کاری نے انھیں اس قدرمرعوب کیا کہ وہ اظہار جذبات میں عریانیت کی کھلی کھلی تصویریں پیش کرنے سے بھی گریز نہ کرسکے جس

سے کہ وہ بعض ناقدین ادب کی نظر میں معتوب تک قرار پائے۔انگریزی ناول ''سنس اینڈ لورس'' میں لیڈی چیٹر لی اور باغبان کی ملاقات اور رفعت اور عذرا کا آپس میں ملنا ایک جیسا منظر پیش کرتا ہے۔

''لیڈی چیٹر لی اور باغبان کی ملاقات ایک باغ میں ہوتی ہے۔رات کی تنہائی ہے۔چاندنی چٹکی ہوئی ہے۔لیڈی چیٹر لی بالکل باریک شب خوابی کے لباس میں ہے۔باغباں باغ میں ٹہل رہا ہے اور لیڈی چیٹر لی وہاں داخل ہوتی ہے اور اس کے بعد ان دونوں کی ملاقات ومباشرت کی جو تصویر لارنس نے کھینچی ہے ،اس کا رفعت وعذرا کی ملاقات میں مشاہدہ فرمائیں۔فرق صرف اس قدر ہے کہ وہاں باغباں باغ میں موجود ہے اور لیڈی چیٹر لی داخل ہوتی ہے اور یہاں عذرا انگریزی لباس شب خوابی پہنے ہوئے باغ میں ٹہل رہی ہے اور رفعت داخل ہوتا ہے۔''[۱]

عشق ومحبت میں گرفتار دوجاں کے جسمانی رشتوں کو کھل کر بیان کرنا انگریزی میں ڈی ایچ لارنس سے پہلے کے ناول نگاروں کے یہاں معدوم تھا۔ ''لیڈی چیٹر لیز لور'' میں انھوں نے جس انداز میں جذباتی ونفسیاتی کیفیات کو اجاگر کیا ہے وہ لائق ستائش ہی نہیں بلکہ استادانہ کمال کا حصہ ہے۔جذباتی ونفسیاتی حالات وکیفیات کو نشیب وفراز کے ساتھ بیان کرنا لارنس کا منفرد انداز ہے جسے فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ پیش کرنے کا ملکہ صرف اسی تک محدود ہے۔لارنس سے قبل اور بعد کے انگریزی ناول نگاروں میں یہ امتیازی وصف نہیں ملتا لیکن اردو میں عزیز احمد نے یہ انداز اپنا کر لارنس کی راہ اختیار کی ہے۔یہ درست ہے کہ عزیز احمد نے فحش وعریاں نگاری کو اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا مگر وہ معاشرہ کے مسائل کو بھی فراموش نہیں کر سکے۔تبھی تو ان کے ناولوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عمدہ عکاسی ملتی ہے جس کی بہترین نظیر ''گریز'' ہے۔ڈی ایچ لارنس کا مشہور ومعروف ناول ''سنس اینڈ لورس'' نئے معاشرہ میں محبت کی مختلف شکلوں کو پیش کرتا ہے۔''گریز'' میں نئی تہذیب وتمدن کے سایہ تلے محبت کی نئی قسموں اور

نوعیّتوں کوسامنے لاتا ہے۔نعیم کی عشق بازیاں الگ نوعیت کی ہیں۔اس کا جنسی تعلق آہستہ آہستہ عشق کا روپ لیتا ہے۔اس تعلق سے یہ اقتباس دیکھیں:

''محبت کی بنیاد جنس ہے،لیکن اس بنیاد پر جب محبت کی عمارت کھڑی ہوجاتی ہے تو یہ نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔وہاں جنس سر بہ زانو نظر آتی ہے اور محبت سرخ رو۔محبت جب جنسیت پر غالب آجاتی ہے تو پھر مرداور عورت کے تعلقات ایک نئ مسرت بخش تسکین آمیز فضامیں پرورش پانے لگتے ہیں۔اس فضا کو پیش کرنے میں عزیز احمد کی نفسیاتی ژرف نگاہی اور انسانی جذبات سے مکمل آگہی ظاہر ہوتی ہے۔''۲

عزیز احمد کو اردو کا ڈی ایچ لارنس کہا جاتا ہے کیوں کہ جو کام لارنس نے انگریزی میں کیا وہی عزیز احمد نے اردو میں کر دکھایا۔انھوں نے جنس کی کثرت اور محبت کی لطافت کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے روحانیت اور پاکیزگی کے ساتھ سکون اور فرحت بخش کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔یہ ان کا وصف خاص ہے اردو ناول نگاری میں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔جنسی عمل کو محبت کے لطیف جذبہ میں داخل ہو کر پاکیزگی کی شکل میں پیش کرنے کا ہنر اردو ادب میں مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ڈی ایچ لارنس کے ناول ''سنس اینڈ لورس''میں بھی جنسیت کی کثافت میں محبت کی لطافت کا میلان و جذبہ پایا جاتا ہے۔

تکنیک کے لحاظ سے ''گریز''ایک ایسا ناول ہے جس میں متضاد انداز اپنائے گئے۔اس میں خطوط بھی ہیں،ڈائری بھی ہے اور تاثراتی انداز بھی ہے اور کچھ حد تک شعور کی رو بھی ہے۔اس کی ہیئت بالمقابل ''سنس اینڈ لورس'' کے روایتی ہے ناول کے تینوں حصے ابتدا،درمیان اور اختتام پوری طرح واضح ہیں۔لارنس کی مانند انھوں نے ناول کی ہیئت میں ایسی کوئی خاص بڑی تبدیلی نہیں کی باوجود اس کے ''گریز'' کا انداز منفرد حیثیت کا حامل ہے جبکہ ڈی ایچ لارنس نے نہ تو کوئی نیا تجربہ کیا اور نہ ہی روایتی انداز سے انحراف کی صورت پیدا کی۔یوں ''گریز''اور''سنس

اورلورس'' میں گہری مطابقت اور کافی حد تک مماثلت ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں نکلتی۔

''شام اودھ'' احسن فاروقی کا ڈرامائی انداز پر مبنی بہترین ناول ہے۔اس کا مطالعہ قاری کو ایک طرف والٹراسکاٹ کے ناول ''اولڈ مورٹیلٹی'' Old Mortality کی فضا سے روشناس کراتا ہے تو دوسری طرف جین آسٹن کی تکمیل محدودیت کی طرف لے جاتا ہے۔ناول میں مرکزی قصہ،تصادم اور کشمکش تینوں چیزوں کو شامل کیا گیا ہے۔اس طرح کے ناولوں میں کرداروں کے ذریعہ مسائل پیدا کیے جاتے ہیں اور وہی ان کا حل بھی تلاش کر لیتے ہیں۔

والٹراسکاٹ کی طرح ''شام اودھ'' میں تاریخی واقعات کے ساتھ رومانویت بھی ہے۔اسکاٹ کے ناولوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے یہاں تاریخی منظرکشی کے واضح نقوش ہیں۔طبقۂ اولیٰ کے خاندانوں کے حیات ومعاشقوں کی عکاسی انھوں نے فنی بصیرت کے ساتھ کی ہے۔''شام اودھ'' میں قدیم پس منظر اور لکھنوی تہذیب وتمدن کی منظرکشی ،ناول میں جگہ جگہ رومانی فضا کا دیدار اور گزرے ہوئے وقت میں انسان کی قدر وعظمت کو پیش کیا گیا ہے۔ احسن فاروقی لکھتے ہیں:

''نواب صاحب بارہ دری میں آکر مسند پر جلوہ افروز ہوئے۔سب لوگ ادھر ادھر بیٹھ گئے۔ایک نوکر نے آگے پیچوان لگایا۔دوسرا ایک بڑا سونے کا خاصدان لیے آیا اور حضور کے سامنے رکھ دیا۔متعدد نوکر چاندی کی چھڑیں لگے ہوئے عمدہ کپڑوں کے پنکھے جھلنے لگے۔لالہ جی گھر سے کھانا کھا کر واپس آگئے تھے اور نواب صاحب کی مسند کے پاس قالین پر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر پان وغیرہ تقسیم ہوتے رہے۔اتنے میں سازندے آئے۔نواب صاحب کو سلام کر کے بیٹھے اور اپنے ساز ٹھیک کرنے لگے۔''[۳]

یہ نیم تاریخی ناول ہے جس کا اعتراف خود ناول نگار نے کیا ہے۔اس

میں والٹر اسکاٹ کی مانند تخیل سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ سے ''شام اودھ'' بڑا تاریخی ناول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اسلم لکھتے ہیں:

''شام اودھ'' بنیادی طور پر ایک رومانی ناول ہے مگر اس میں لکھنؤ کے زوال پذیر جاگیردارانہ تمدن کا خوبصورت مرقع پیش کیا گیا ہے اور نہایت اثر انگیز انداز میں اس تمدنی ماحول کی نقاشی کی گئی ہے۔''[۴]

ناول زوال آمادہ تہذیب و معاشرت کی تصویر بیاں کرتا ہے۔ فاروقی نے رومانیت پیدا کر کے اسے مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔ ''شام اودھ'' کی ورق گردانی قاری کو ایسے ماحول سے مانوس کراتی ہے جس سے والٹر اسکاٹ کے ناول Old Mortality کی فضا ذہن میں سما جاتی ہے۔ لکھنوی تہذیب کی منظر کشی اور رومانیت کی اثر انگیزی کے علاوہ ناول میں حیدر نواب، انجمن آرا اور نو بہار کی تثلیث بیان کی گئی ہے جس سے ذہن جین آسٹن کی تکمیل محدودیت کی جانب رخ کر جاتا ہے۔

احسن فاروقی کی طرح قرۃ العین حیدر بھی مغربی فنکاروں سے متاثر ہوئیں۔ ان کے فن پاروں کا عمیق نظر سے کیا گیا مطالعہ اس نتیجہ پر لے جاتا ہے جہاں ان کے ناول انگریزی ناولوں کے اثرات میں غرق دکھائی پڑتے ہیں۔ کافی حد تک ان کی تخلیقات انگریزی زبان و ادب سے استفادہ کرتی نظر آتی ہیں۔ خود کلامی ان کی ناول نگاری کی اہم خصوصیت ہے اور شعور کی رو سے خود کلامی کا گہرا تعلق ہے جس کے لیے ناول نگاروں نے چار طریقے اپنائے ہیں جو کچھ اس طرح ہیں: (۱) بلا واسطہ داخلی کلام Direct Interior Monologue (۲) بالواسطہ داخلی کلام Indirect Interior Monologue، (۳) ہمہ بین و ہمہ داں مصنف کا بیان Omniscient Author's Description (۴) خود کلامی Soliloquy

موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے ان کے ناول انگریزی کے بعض ناولوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ماورائیت کا رجحان اور داخلی تجربات جیسے عناصر بھی

انگریزی ادب کے مرہون منت ہیں۔اکثر وبیشتر ان کے بارے میں یہ سنا جاتا ہے کہ وہ ورجینا وولف سے متاثر ہیں جس کی انھوں نے تردید بھی کی ہے مگر شعور کی رو کی تکنیک کا ان کے ناولوں میں پایا جانا اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ قرۃ العین حیدر غیر شعوری طور پر ان سے متاثر ہیں۔

بلاواسطہ داخلی کلام Direct Interior Monologue کو جیمس جوئس نے اپنے ناول ''یولسس'' Ulysses میں نہایت عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں بھی یہ تکنیک نمایاں ہے۔درخشندہ ''میرے بھی صنم خانے'' کا بنیادی کردار ہے جو اوشبر کے ذہن ودل پر پوری طرح مسلط ہے۔اوشبر اس کے بارے میں سوچتا ہے کہ وہ بہت حسین وجمیل تھی۔وہ امرتا شیر گل کی مانند سیدھی مانگ نکال کر اپنے لمبے اور سیاہ بالوں کو پیچھے ڈال لیتی تھی۔گلاب کے پھول جھاڑیوں کے بجائے گلدان میں زیادہ رنگین، زیادہ روشن اور جاندار لگتے ہیں۔۔۔وہ ان کرداروں میں سے تھی جو سارناتھ کی دیواروں اور وشوابھارتی کے صنم کدوں کے نقوش میں نظر آتے ہیں۔اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے کہیں آگ لگ گئی ہے اور اس کے شعلوں کی سرخ پرچھائیاں آنکھوں میں گھسی جارہی ہیں۔

''آگ کا دریا'' میں قرۃ العین نے قدیم ہندوستان کی جڑوں تک پہنچ کر تاریخی، سماجی اور تہذیبی فکر وخیالات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔گوتم نیلمبر اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو فلسفیانہ خیالات کی ترجمانی کرتا ہے اور حیات وکائنات پر غور وفکر میں مبتلا رہتا ہے۔ہری شنکر بھی گہرائی میں ڈوب کر سوچتا ہے۔ان کے مابین گفتگو اس بات کی غماز ہے:

''تم کاہے کی تلاش میں ہو ----؟'' ہری شنکر نے کہا۔''میرے یہاں تو ساری تلاش ختم ہو چکی ہے۔''

''اگر میری درسگاہ میں اعلیٰ اخلاق برتنے کا اپدیش نہ دیا جاتا تو میں یہی کھڑاؤں تمہاری ناک پر لگاتا----!''

ہری شنکر نے قہقہہ لگایا:''اگر مجھے دوستوں کی ضرورت نہ رہی ہوتی تو میں تمہیں اپنا دوست بنالیتا۔''

''تم خود پرست ہو۔''

''اور تم ذہن کے غرور میں مبتلا ہو۔''

''تمہیں ناٹک سے دلچسپی ہے----؟'' گوتم نے موضوع گفتگو بدلا۔

''تھی----''مختصر جواب ملا۔

''اچھا----؟؟ مگر الفاظ کا ناٹک تو تم ہر سے کھیلتے ہو۔'' ہری شنکر خاموش رہا۔اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔گوتم جوش میں آکر بولتا رہا:''تین سو سال ہوئے تمہارے تکسشلا میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام پانِنی تھا۔اس نے الفاظ کے اسرار کی ایک نئی کائنات دریافت کی تھی۔جب تلاش ختم ہو چکی ہے تو الفاظ کا استعمال کیوں کرتے ہو۔الفاظ کو بھی ملتوی رکھو۔''۵

گوتم نیلمبر اور ہری شنکر کے درمیان اس قسم کی طویل فلسفیانہ گفتگو ہوتی ہے اور وہ دیگر کرداروں سے بھی ایسے ہی ڈوب کر بات کرتا ہے۔قرۃ العین حیدر ''میرے بھی صنم خانے''میں کرداروں کو ورجینیا وولف کی مانند مختلف طریقے سے واقف کراتی ہیں۔ورجینیا وولف ناول میں ایک ایسا انوکھا طریقہ اپنانا چاہتی تھیں جس کے ذریعہ وہ اپنے ذاتی تجربات کو احسن طریقے سے پیش کر سکیں اور اسی انداز کو قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے نالوں میں برتا ہے۔

ورجینیا وولف کا ناول''اورلینڈو''"Orlando"ایک علامتی ناول ہے جس میں ایک انگریز کردار کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔انھوں نے اس حقیقت سے روبرو کرانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز کردار سولہویں صدی سے عصر حاضر تک کن مراحل سے ہو کر گزرا ہے۔انگریز کردار کی علامت اورلینڈو اس دوران تمام عرصہ حیات رہا جسے ورجینیا ولف نے مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے۔ ابتدا میں اورلینڈو ایک جنگ جو اور بہادر نواب زادہ ہوتا ہے اور انیسویں صدی

میں یہ کردار عورت کا روپ اختیار کرلیتا ہے۔مصنفہ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ سولھویں صدی میں انگریز عروج کی سطح پر تھے۔وہ بہادر، دلیر اور باہمت لوگ تھے جنھوں نے دنیا بھر کو اپنی حکمرانی میں لے لیا تھا۔اورلینڈو کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

"He was careful to avoid meeting anyone. There was stubbs, the gardener, coming along the path. He hid behind a tree till he had passed. He let himself out at a little gate in the garden wall. He skirted all stables, kennels, breweries,carpenters' shops,wash houses, places where they make tallow candles, kill oxen...."

ترجمہ:''وہ محتاط قسم کا آدمی تھا جو لوگوں کے ملنے سے گریز کرتا تھا۔راستے میں پیڑ تھے جہاں سے باغباں گزرتا تھا۔جب تک باغباں نہ چلا جاتا تھا تب تک وہ خود کو پیڑ کی آڑ میں چھپائے رہتا۔وہ باغ کی دیوار میں لگے چھوٹے سے دروازے میں سے نکل آتا ہے اور اصطبلوں، کتا گھروں ، شراب کی فیکٹریوں، بڑھئی کی دکانوں، چونے کی دوکانوں،ان جگہوں سے جہاں موم بتیاں تیار ہوتی ہیں، بیلوں کو مارا جاتا ہے، کے کنارے کنارے چلا آتا ہے۔''[6]

قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا''''اورلینڈو'' سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔اس ناول کے کردار، گوتم، کمال اور چمپا ''اورلینڈو'' کی مانند حقیقت پسند ہیں۔دونوں ہی ناول زمانہ کی تبدیلی کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔اورلینڈو کی طرح گوتم بھی الگ الگ شکل وصورت اختیار کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر، ورجینیا وولف سے بھی متاثر ہیں۔ورجینیا وولف شعور یا

لاشعور کے تحت اپنے ناول میں جو پیش کرتی ہیں اس کا خاکہ وہ پہلے ہی طے کر لیتی ہیں اور پھر مخصوص کردار کے شعور کی رو میں واقعات کی جزئیات کو سامنے لاتی ہیں۔قرۃ العین حیدر بھی ''آگ کا دیار'' میں یہی روش اپناتی ہیں۔البتہ تخیل کی سطح پر قرۃ العین حیدر ورجینیا وولف سے بلند درجہ پر فائز ہیں۔قرۃ العین حیدر اور ورجینیا وولف کے ناولوں میں مختلف مواقع پر پیش آنے والے احساسات اور کرداروں کی حسیات کے اعتبار سے بھی مشابہت پائی جاتی ہے۔دونوں زبانوں کی ناول نگار ہر موضوع کی گہرائی میں اتر کر ایسے مضمرات پیش کرتی ہیں جو محسوسات کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

انگریزی کی معتبر ناول نگار جارج ایلیٹ اور قرۃ العین حیدر کو بھی تقابل کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔دونوں ناول نگاروں کے درمیان یہ پہلو مشترک ہے کہ جارج ایلیٹ نے اپنے عہد میں انگریزی ناول نگاری کو جو سمت و رفتار عطا کی وہی کوشش قرۃ العین حیدر نے اردو ادب کے لیے کامیابی کے ساتھ انجام دی ہے۔ ایلیٹ کی عمدہ تصانیف انگریزی ادب کے فروغ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔دوسری طرف قرۃ العین حیدر اردو ادب کا درخشندہ ستارہ ہے جس نے ''آگ کا دریا''، ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''کار جہاں دراز ہے'' وغیرہ جیسے مایہ ناز ناول لکھ کر اردو ادب کے سرمایہ میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اردو ناول نگاری کو نئی جہت سے بھی روشناس کرایا۔

''اداس نسلیں'' کا کینوس پہلی جنگ عظیم سے تقسیم ہند تک کے واقعات تک پھیلا ہوا ہے۔اس پر متعدد مغربی فنکاروں کے فکری رجحانات کا اثر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ حسین نے اسے لکھتے وقت ایچ جی ویلز اور ارنیسٹ ہیمنگ وے کے ناولوں کو سامنے رکھا ہوگا۔جنگ عظیم کا موضوع ویلز کے کئی ناولوں میں برتا گیا ہے اور وہی معرکہ آرائیاں ''اداس نسلیں'' کا جز بنیں۔اس تعلق سے یہ اقتباس قابل غور ہے:

''انگریزی ادب سے اثرات قبول کرنے والا ناول نگار اگر اپنی تخلیق میں جنگ عظیم کو موضوع بنانا چاہتا ہے تو اس کی نگاہ ویلز کے ۔۔ناولوں پر ضرور پڑے گی۔''ے

''اداس نسلیں''میں حقیقت نگاری کو بطور احسن پیش کیا گیا ہے اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی زندگی اور شہری و دیہی کرداروں کی عکاسی کرتے ہوئے تاریخ کے مختلف زمانوں کو یک بہ یک دکھایا گیا ہے۔ناول کے وہ مختلف زمانے دراصل تین ادوار یعنی سامراجی دور، آزادیٔ ہند کا عہد اور تقسیم کے فوراً بعد کا عہد ہیں۔''اداس نسلیں'' پنجاب سے وابستہ کسانوں کے حالات، جاگیرداروں کے ظلم واستحصال، مزدوروں اور محنت کش طبقے کی محرومیوں سے گزرتے ہوئے وسیع کینوس تک پھیل جاتا ہے۔کہانی کا مرکزی کردار نعیم نفسیاتی وذہنی کیفیات سے مسلسل گزرتا رہتا ہے۔ ماضی کی گم شدہ یادیں اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک لیتی ہیں۔عبداللہ حسین کو بیانیہ پر مکمل دسترس حاصل ہے جو کہ کسی بھی ماحول یا فضا پر قابو پا لیتے ہیں۔بیانیہ پر کامل دستگاہ کے سبب وہ تضاد کو بھی نمایاں کرتے چلے جاتے ہیں اور تطہیر جذبات کا رول بھی ادا کرتے ہیں۔ان کی نثر میں بلا کی تیزی ہے ۔عبداللہ حسین کا یہی وصف انھیں صورت حال کی بھرپور عکاسی پر مجبور کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ داخلی زندگی اور دلکش مناظر کی پیش کش کے تحت قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔جنس کا تفصیلی اور بے باکانہ تذکرہ ڈی ایچ لارنس کے نظریہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔لارنس کا ماننا ہے کہ کھلے طور پر جذبات کے اظہار میں کوئی برائی نہیں ہے۔

گاؤں اور دیہات کا تذکرہ جس انداز سے کیا گیا ہے وہ ٹامس ہارڈی کی یاد دلاتا ہے جن کے زیادہ تر ناول دیہی زندگی پر محیط ہیں۔عبداللہ حسین ''اداس نسلیں''میں شہر اور دیہات کی زندگی سے روشناس کراتے ہیں۔انھوں نے گاؤں کے باشندوں کے ایک دوسرے کے روابط، انداز گفتگو، کسانوں کے معاملات ومسائل اور دیگر مشاغل کو عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔یوں ناول نگار نے گاؤں

کے ہر پہلو کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔گاؤں کے ماحول اور تہذیب ومعاشرت کے اعتبار سے گاؤں کے کرداروں کی زبان وہی استعمال کی گئی ہے جو گاؤں میں بولی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ استعمال ہونے والی گالیاں بھی ناول کا حصہ بن گئی ہیں۔

خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن''میں جین آسٹن کا گھریلو ماحول اس بات کا شاہد ہے کہ وہ ان کے فکروخیالات کی دلدادہ ہیں یہی وجہ ہے گھریلو ماحول کی عکاسی میں خدیجہ مستور نے فنی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ان کے ناول پر جین آسٹن کے اثرات واضح نظر آتے ہیں جس کی نمایاں مثال گھریلو معاملات ومسائل ہیں۔آسٹن کے ناولوں کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات کھل سامنے آتی ہے کہ ''آنگن'' پر آسٹن کی گھریلو کیفیات اور دلنشیں فضائیں حجومتی دکھائی دیتی ہیں۔جین آسٹن کا وصف خاص یہ ہے کہ انھوں نے گھر کے اندر ہی مکمل معاشرہ کو داخل کردیا ہے جو ایک طرح سے سماج کا آئینہ کہا جاسکتا ہے۔ناول میں گھر نہ صرف گھر ہے بلکہ پورے معاشرے کی تصویر کشی کرنے والا آئینہ بن گیا ہے۔ ''آنگن''میں بھی باہر کی سیاسی سرگرمیاں اور مسلم لیگی وکانگریسی گروہ دکھائی دیتے ہیں۔

خدیجہ مستور نے اس ناول کو فلیش بیک تکنیک میں لکھا ہے۔اس کی ابتدا فلیش بیک میں بحسن وخوبی انجام پاتی ہے۔کرداروں کا نفسیاتی نقطہ نظر سے مشاہدہ وتجزیہ آسٹن اور خدیجہ مستور دونوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔مذکورہ ناول نگاروں کے یہاں ایک یہ پہلو بھی مشترک ہے کہ ڈرامائی مکالمے آسٹن کے یہاں بھی ہیں اور خدیجہ مستور کے ناول میں بھی جگہ جگہ بکھرے ہیں۔انگریزی ناول نگاری میں جین آسٹن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے محدودیت میں غیر معمولی وسعت پیدا کرکے جداگانہ اور منفرد اسلوب اختیار کیا ہے جسے اردو میں خدیجہ مستور نے بھی اپنایا۔

اردو اور انگریزی کے چند ناولوں پر محیط اس مختصر جائزہ سے یہ حقیقت

آشکار ہو جاتی ہے کہ اردو ناولوں میں انگریزی ناول کے اثرات، تقلید، مشابہت، ہو بہو نقل اور استفادہ کی مختلف صورتیں اور متعدد پہلو موجود ہیں۔ کہیں موضوعات اور تکنیک یکساں ہیں، کہیں فکر و فن میں مشابہت پائی جاتی ہے اور کہیں ناول کی فضائیں ایک جیسی ہیں۔

حواشی:

۱۔اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، ڈاکٹر ایم عظیم اللہ، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ص:۲۱۳

۲۔ایضاً، ص:۲۲۲

۳۔شام اودھ: محمد احسن فاروقی، ص:۱۴۔۱۳

۴۔اردو ناول آزادی کے بعد: ڈاکٹر اسلم آزاد، نکھار پریس، مئو، ۱۹۸۱ء، ص:۱۶۹

۵۔آگ کا دریا، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۲۱، ص:۲۳

۶۔اورلینڈو، ورجینیا وولف، ای بک، ۲۰۰۶، ص:۱۴

۷۔اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، ڈاکٹر ایم عظیم اللہ، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ص:۲۸۹

****